ڈاکٹر غلام محمد

اِک پیکرِ محبوبی

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست

پیر رومی نے آج سے سات سو برس پہلے اس حسرت بھری آرزو کا اظہار کیا تھا' حالانکہ اس وقت پھر بھی جنسِ انسانی ایسی نایاب نہ ہوگی' مگر آج کے دور میں تو یہ محض خوش بختی کی بات ہے کہ کسی متلاشی کو کہیں کوئی ''انسان'' مل جائے' وہ انسان جو لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم کا مصداق' قالب وقلب دونوں اعتبار سے ہو' جو کھلی نظر میں تخلیق ربانی کا شاہکار دکھائی دے جائے' اور محبوبیت کا پیکر ہو..... وہ نہ دیو ہو نہ فرشتہ' بلکہ ہو ''انسان''۔ ہر مخلوق سے والا شان۔

مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کی ہلکی سی عکاسی اسی زاویہ سے ایک ایسے مصور کے ذریعہ ہوگی جس کا تعلق اس ہستی سے نہ نرے اعتقاد کا تھا' نہ شاگردانہ اعتراف کا' بلکہ وہ اس کی زندگی کی ''زیباروی'' کا دلدادہ تھا' اس کی انسانی عظمت کا قدرشناس تھا۔

مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے اس مہجور کا قریبی رابطہ غالباً ۱۹۵۴ء سے قائم ہوا۔ گو تعارف کا شرف اس سے تین سال قبل سے حاصل تھا۔ جب قریب سے دیکھا تو دل نے کہا کہ یہ ایک عالم ''عبقری، سریع الذہن، قوی الحافظہ اور پیکر عمل'' ہی نہیں، بلکہ وہ ہیں جس کی تلاش تھی۔ ایک اچھے انسان، اقدار انسانی کو علم لفظی سے زیادہ اہمیت دینے والے، دوست دار و دوست نواز! دل شناس و دلدار! پھر جتنا جتنا تعلق بڑھتا گیا وہ ایک پیکر محبوبی نظر آئے۔ اظہار میں بھی اور سکوت میں بھی! بگڑنے میں بھی اور سنورنے میں بھی۔ غیض وغضب میں بھی، شفقت و ترحم میں بھی، عروج میں بھی، نزول میں بھی۔

سیرت یوسفی کے جمال معنوی کا سب سے پرکشش پہلو ''وما ابری نفسی ان النفس لامارۃ

اور حکومت کو جھنجھوڑا وہ انہی کا حصہ تھا' مگر کوئی طاقت مولانا کا بال بیکا نہ کرسکی' وجہ کیا تھی؟ وہ نصرتِ خداوندی تھی اور نصرتِ الٰہی کیوں شامل رہی؟ اس لئے کہ ہر تقریر سے پہلے مولانا نے اپنے رب سے اس فتنہ کے استیصال کے لئے بہت رو رو کر دعائیں مانگیں' اپنی جان کو اس کی خاطر قربان کرنے کی نیت فرمالی اور جب گھر سے ممبر کی طرف آئے تو اس عزم سے آئے کہ اب گھر لوٹنا نہیں ہے! یہ کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے' بلکہ مولانا کی زبان سے سنی ہوئی سچی بات ہے۔

اخلاص! انسانی کردار کا اعلیٰ ترین جوہر ہے' مولانا اس میں فرد تھے' اوپر کے واقعات سے اس کا اندازہ ہوا ہوگا' ایک اور واقعہ سنئے۔ کوئی بارہ، چودہ برس قبل کا! سنا سنایا نہیں! چشم دید۔

جہانگیری مسجد (کراچی) کے منتظمین نے مولانا سے تقریر کا وعدہ لیا' جس رات کو تقریر تھی' اتفاق سے بعد مغرب' میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا' فرمانے لگے کہ: جہانگیری مسجد میں میری تقریر ہے' عشاء کی نماز کے فوراً بعد ہوگی اور کچھ زیادہ لمبی تقریر نہیں کرنا ہے' آپ بھی ساتھ چلیں' میں نے عرض کیا کہ: جو لمحات آپ کے ساتھ گذر جائیں وہی تو کام کے لمحات ہوں گے' چنانچہ ہم دونوں مسجد پہنچ گئے' عشاء کی نماز میں روزانہ کے معمول کے مطابق کوئی ڈھائی تین صفیں ہوں گی اور ختم نماز پر تو صرف چند آدمی رہ گئے تھے۔ ''چند'' محاورہ ادب میں یعنی بارہ کے اندر اندر' کچھ عقدہ نہ کھل سکا کہ ماجرا کیا ہے؟ مولانا نے چپکے سے مجھ سے فرمایا: آٹھ دس آدمیوں میں کیا تقریر ہوگی؟ میں نے اس بے تکلفی کی بناء پر' جس پر خود مولانا کی شفقت نے کر رکھا تھا' عرض کیا کہ: ''جو کچھ ہے اللہ کی خاطر ہے' لوگ کم رہیں خواہ زیادہ، مختصر ہی سہی' مگر تقریر ضرور ہوگی۔'' بس یہ بے ساختہ جملہ اس صاحبِ اخلاص عالمِ ربانی کے دل پر ایسا اثر کر گیا کہ پھر تقریر ہوئی اور کوئی گھنٹہ بھر ہوئی' اور اس قدر پرتاثیر اور جذبِ الٰہی کا اثر لئے ہوئے کہ صاف یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب مولانا کی نگاہ میں کوئی غیر ہے ہی نہیں' وہ بس اللہ کی خاطر کہے جارہے ہیں' آگے یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ ان کی آواز کو انس وجن تک پہنچادے۔

یہ تھے مولانا کی معنوی سیرت کے چند جلوے۔ اب ظاہری پہلو پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجئے۔

مولانا نہ صرف خود جمیل وشکیل تھے، بلکہ جمالیاتی ذوق ان کی سرشت کا خمیر تھا اور شعریت ان کے مزاج کی چاشنی! فطری مناظر دیکھ کر ان کی طبیعت جھوم جاتی تھی۔ بہادر آباد (کراچی) کی پہاڑی پر آج جو ایک شاندار مسجد ہے' اس وقت صرف ابھی اس کا چبوترا ہی بنا تھا' شب برأت یا ایسا ہی کوئی موقع آ گیا' اہلِ محلہ نے میری وساطت سے مولانا کی تقریر وہاں رکھوائی' جب مقررہ شب کو ہم وہاں پہنچے ہیں تو پہاڑی پر چڑھ کر کراچی گویا ہماری ہتھیلی میں تھی' کھلے چبوترے پر چاند کی ضیاباری اور نرم وخنک ہوا کا تموج عجب لطف دے رہا تھا' مولانا کی فطرت پسند طبیعت وجد میں آ گئی' تخت پر رونق افروز ہوئے' کوئی ڈیڑھ گھنٹہ تک سامعہ نواز رہے۔ بیان میں

زمانہ میں اس کے عملی مراحل بھی طے فرمائے' لیکن ظاہری وضع کبھی ایسی نہیں بنائی جس سے آپ کا شیخِ طریقت ہونا ظاہر ہوتا ہو' اور چونکہ ایک بلند پایہ محدث تھے اور اتباعِ سنت کا دل و دماغ پر غلبہ تھا' لہٰذا ان بدعات سے ہمیشہ مجتنب رہے جو متصوفین کے ہاں عام طور پر پائی جاتی ہیں اور جنہوں نے حقیقی تصوف کو شدید نقصان پہنچایا ہے' جو احسان کے ہم معنی تھا۔ بہرحال مقصود یہ عرض کرنا ہے کہ مولانا روحانیت کی اس وادی سے بھی جس کا نام تصوف ہے' علمی طور پر خوب واقف وشناسا تھے' اور عملاً اس کی سیر کر چکے تھے۔

حضرت بنوری نوراللہ تعالیٰ مرقدہ کی زندگی کا جمالیاتی پہلو بھی نہایت روشن، درخشاں اور دلکش پہلو تھا' آپ کی ہر ہر ادا اور ہر ہر نقل وحرکت میں حسن و جمال کی چمک اور نظافت ونفاست کی جھلک تھی' گویا آپ اس صفتِ الٰہی کا ایک نمایاں مظہر تھے' جس کا حدیثِ نبوی ''ان اللہ جمیل یحب الجمال'' میں ذکر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی ذات کو جہاں ظاہری و باطنی وافر حسن و جمال سے آراستہ و مزین فرمایا تھا' وہاں انہیں حسن و جمال کا پاکیزہ اور اعلیٰ ذوق اور قوی احساس بھی مرحمت فرمایا تھا' چنانچہ اس کا اظہار وانکشاف آپ کی صورت وشکل، وضع قطع، رفتار وگفتار، نشست و برخاست، نیز آپ کے لباس و پوشاک، خورد ونوش، میل ملاپ، لین دین، تعلیم وتعلم اور نظم وضبط وغیرہ ہر ہر چیز سے ہوتا تھا' لہٰذا آپ کے اندر ایک شانِ محبوبیت تھی' جو سلیم الفطرت انسان آپ سے ملتا، آپ کی مجلس میں بیٹھتا، گفتگو سنتا اور کچھ کھاتا پیتا، ضرور فریفتہ اور گرویدہ ہو جاتا' اور آپ کی نورانی شخصیت کا اس کے دل و دماغ پر ضرور اثر پڑتا' ناممکن تھا کہ کوئی اخلاص کے ساتھ آپ سے ملے اور پھر آپ کے حسنِ اخلاق سے متاثر نہ ہو' بلکہ بعض دفعہ صرف آپ کو دیکھنے ہی سے دل و دماغ پر نہایت خوشگوار اثر مرتب ہوتا' اور آدمی مرعوب ہو جاتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا قدس اللہ تعالیٰ سرہ العزیز ہمارے ہاں مجلس علمی میں تشریف لائے' اس وقت لائبریری میں جو لوگ مطالعہ کر رہے تھے' ان میں سے ایک صاحب ڈاکٹر الطاف جاوید بھی تھے' جو غیر معمولی علم و ذہانت کے ساتھ اس وقت اشتراکی ذہن رکھتے تھے' بعد میں نہایت متشرع صوفی بن گئے' حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد اندر تشریف لے گئے' ڈاکٹر موصوف نے مجھ سے پوچھا کہ: یہ حضرت کون تھے؟ میں نے بتلایا' تو کہنے لگے کہ: جب دروازہ سے داخل ہو رہے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ان کے ساتھ نورانی صورتوں کی ایک جماعت ہے، لہٰذا میرا دل انہیں دیکھ کر بہت متاثر' بلکہ مرعوب ہے۔

حسن و جمال سے حضرت مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ کا ایسا طبعی لگاؤ تھا کہ جس چیز میں حسن و جمال دیکھتے اس سے ضرور متاثر اور خوش ہوتے اور اسے ضرور خراجِ تحسین پیش کرتے' عام ہے کہ وہ چیز قدرتی مناظر سے بھی ہوتی' جیسے کوئی حسین وادی، پہاڑ، جھیل، دریا، آبشار وغیرہ یا وہ کسی خوبصورت پتھر، پھول، پھل، پرندے اور

مولانا شہرت وعظمت کے جس بلند رتبہ پر پہنچ چکے تھے، اس نقطۂ عروج پر پہنچ کر ایک ''غیر انسان'' اپنی رائے سے ایک انچ ہٹنا گوارا نہیں کرتا' مگر مولانا کی حقیقی عظمت یہی تھی کہ فی اعین الناس کبیراً (لوگوں کی نگاہ میں بڑے) ہوکر بھی ہمیشہ ''فی عینی صغیراً''(۱) (اپنی نگاہ میں چھوٹے) ہی رہے' انہیں اپنی رائے سے رجوع کرنے اور اپنے مخالف سے، وجہ مخالفت کے ہٹ جانے پر، بلا تامل مل لینے میں ذرہ برابر تامل نہ ہوتا' یہ ان کی بے نفسی اور صاف دلی کی کھلی علامت تھی' اس کا مشاہدہ راقم الحروف کو اپنی یک سالہ ماہنامہ ''بینات'' سے وابستگی کے دوران خوب ہوتا رہا' ایک مرتبہ مسئلہ مشین کے ذریعہ جانوروں کے ذبیحہ کے جائز وناجائز ہونے کا درپیش تھا' اس مسئلہ کو مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدیر برہان (دہلی) نے اٹھایا تھا' اور اس کے جواز پر دلائل قائم کئے تھے' پاکستان میں بعض جلیل القدر اہلِ افتاء کا رجحان (فیصلہ نہیں) اس کی تائید میں موصول ہوا تھا' مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب یہ سب چیزیں آئیں تو وہ بھی غیر تحریری طور پر اس کے جواز کے مؤید ہوگئے' مگر ایسے میں مولانا مفتی محمود صاحب نے اس کے خلاف یعنی شین کے ذبیحہ کے عدم جواز میں ایک مدلل تحریر مولانا کی خدمت میں بھیج دی' جب مولانا نے یہ دلائل پڑھ لئے تو فوراً فرمادیا کہ: مفتی صاحب کے دلائل قوی ہیں' مشین کا ذبیحہ درست نہیں۔

اس سے بڑھ کر ایک اور واقعہ سنئے: راقم الحروف کی ادارتِ بینات کے زمانہ میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن صدر اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی طرف سے سود کے جواز پر بعض تحریریں شائع ہوئیں' ''بینات'' نے ڈاکٹر صاحب کا تعاقب اس علمی قوت سے کیا کہ وہ مضطرب ہوکر مولانا بنوری سے تنہائی میں ملاقات کے طالب ہوئے۔ ملاقات کا وقت متعین ہوگیا' ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے کہلوایا کہ ان کے ساتھ صرف ان کے ماہنامہ ''فکر ونظر'' کے مدیر فاطمی صاحب ہوں گے۔ مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ: پھر آپ بھی بحیثیت مدیر ''بینات'' گفتگو میں شامل رہیں' چنانچہ مولانا کی قیام گاہ پر ہم چاروں کے درمیان گفتگو ہوئی' مولانا نے نہایت مومنانہ صفائی اور قوت سے اپنا اختلاف پیش کیا' ڈاکٹر نے بڑی چابکدستی سے پہلے تو تاویلات کیں کہ اصل مضامین انگریزی میں تھے' مترجم نے بات کچھ سے کچھ کردی' مگر جب احقر نے انگریزی الفاظ پر بھی گرفت کی اور مولانا پر ڈاکٹر صاحب کی فریب دہی واضح ہوئی تو پھر مولانا نے موعظت اور سختی دونوں پہلوؤں سے ڈاکٹر صاحب کا تعاقب کیا اور وہ یہ وعدہ کرنے پر مجبور ہوگئے کہ اپنے ان خیالات سے رجوع کریں گے' اس وعدہ پر مولانا کا دل صاف تھا اور مولانا نے فرمایا کہ: اگر آپ نے یہ کیا تو ہمارا بے مزد مخلصانہ علمی تعاون آپ کے ادارے کے ساتھ رہے گا۔

---

(۱) حضور اکرم ﷺ کی دعا ہے کہ: ''اللھم اجعلنی فی عینی صغیراً وفی اعین الناس کبیراً'' (ترجمہ) اے اللہ مجھے اپنی نگاہ میں چھوٹا اور لوگوں کی نگاہ میں بڑا بنا کے رکھ۔

ڈاکٹر صاحب نے ہم دونوں کو اپنے ادارہ میں آنے کی دعوت دی' مولانا پوری صاف دلی اور بشاشت سے تشریف لے گئے اور ارکان ادارہ کو سارا واقعہ سنایا اور ڈاکٹر صاحب کے رجوع کر لینے پر کامل تعاون کا اعلان فرمایا' اس وقت مولانا ایسے مسرور تھے کہ ایک نادان دینی بھائی، جوان سے بچھڑ گیا، پھر آملا ہے' مگر افسوس! کہ اس پروردۂ مشیگن یونیورسٹی نے مولانا کے اخلاص کی کوئی قدر نہ کی اور آخر وقت تک رجوع شائع نہ کر سکا' یہ اس کا کردار تھا، مگر ہمارے ممدوح کی رفعتِ انسانی اس واقعہ میں کس قدر عیاں تھی۔

مولانا نے کبھی کوئی کام محض عقل و رائے کے سہارے نہیں انجام دیا' اور جب تک رائے کو استخارہ کی تائید حاصل ہو نہیں گئی، اس وقت تک عملی قدم ہرگز نہیں اٹھایا' خود فرماتے تھے کہ: ۱۹۵۰ء جب وہ سعودی عرب میں تھے' خیال یہی تھا کہ حرمین کے قیام کو مستقل ہجرت کی صورت دے دی جائے' مگر اس سے پہلے کہ اس کی نیت کرتے' مولانا نے استخارہ خود بھی کیا اور بعض بزرگوں سے بھی کروایا' جن میں اہم ترین حضرت مولانا عبدالغفور العباسی مہاجر مدنی تھے' سب کا استخارہ یہی نکلا کہ ہجرت کی بجائے واپسی اور کراچی میں قیام..... چنانچہ ایک سال قیام کے بعد کراچی تشریف لائے اور جس بے سروسامانی میں مدرسہ کی بنیاد اپنے رفیق خاص مولانا لطف اللہ کو ساتھ لے کر جامع مسجد نیوٹاؤن میں رکھی، وہ ایک کامل اہلِ توکل ہی کی عزیمت کا کرشمہ تھا اور پھر تائیدِ حق ایسی شامل ہوگئی کہ آناً فاناً وہ ملک کا ایک شاندار دینی مدرسہ بن گیا اور غالباً معیارِ تعلیمی اور طرزِ تربیتی کے اعتبار سے سب سے فائق تر ہے' اور مولانا کی زندہ کرامت کی صورت میں انشاء اللہ تا ابد باقی رہے گا۔

اسی طرح جب ''تحریک ختم نبوت'' کے لئے عملی اقدام کا تقاضہ درپیش تھا تو سات سات مرتبہ مولانا نے استخارہ کیا اور گڑگڑا کر راہ صواب کی دعائیں مانگیں اور جب تائیدِ ربانی کا اشارہ پایا تو پھر بھٹو حکومت جیسی سفاک ظالم ہیئت حاکمیہ سے بے خوف ہو کر اور عوام کی تائید و عدم تائید کے خیال سے بالاتر رہتے ہوئے سربکف میدان میں اتر آئے اور اس قوت و پامردی سے اور اس شبانہ روز بارگاہِ الٰہی میں دعا والحاح کے ساتھ یہ تحریک چلائی کہ چند روز میں حکومت کو مجبور ہو کر ختم نبوت کے منکر کو کافر اور قادیانی فرقہ کو قانونی طور پر خارج از اسلام قرار دینا پڑا' اس اقدام میں مولانا کی سیرت کا رنگ' ناپاک اہلِ سیاست کا سا نہیں تھا' بلکہ قرونِ اولیٰ کے پاک نفس مجاہدینِ اسلام کا مقدس کردار پیش کر رہا تھا:

سیاست تہمتے بر عشق پاکت
ز آئینی خرد بیگانہ بودی

اس سلسلہ کی ایک بات اور یاد آئی' ایوب خان کے دورِ حکومت میں جب ''عائلی قوانین'' بنائے گئے تو بلاشبہ سب ہی علمائے اسلام نے اس کی مخالفت کی' مگر جس شدت سے مولانا نے اس کے خلاف تقریریں کیں'

بالسوء ’’والا وصف تھا۔ راقم الحروف نے دو چار سے زیادہ ایسی ہستیاں نہیں دیکھیں جن میں محاسبۂ نفس کا وہ ہمہ وقتی اہتمام پایا جاتا تھا جو مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ میں نظر آیا۔

’’معارف السنن‘‘ مولانا کا کتنا عظیم اور قابل فخر کارنامہ ہے اور اس کی وجہ سے حنفی مسلک کو کس قدر تقویت پہنچ گئی ہے‘ اس کے باوجود دیکھئے کہ خود مؤلفِ علام کی محاسبہ نگاہ جب اس پر پڑتی ہے تو فخر یا شکر کی جگہ ندامت ہی ندامت چھا جاتی ہے۔

ایک روز میں مولانا کی خدمت میں حاضرہ ہوا‘ دیوان خانہ کھلا تھا‘ مولانا تشریف فرما تھے‘ سامنے معارف السنن کی ایک جلد رکھی تھی‘ میں جھپٹ کر مولانا سے مصافحہ کیا اور ان کے قریب بیٹھ گیا‘ تاکہ انہیں اٹھنے کی زحمت نہ ہو‘ مولانا اس وقت ’’محاسبۂ نفس‘‘ میں غرق تھے‘ فرمانے لگے: اگر اللہ تعالیٰ حشر کے دن مجھ سے یہ پوچھے کہ کیا اس وقت ملت اسلامیہ کی اسی خدمت کی ضرورت تھی؟ کیا ایسے وقت جبکہ ایمان کے لالے پڑے ہوئے تھے، وقت کو انہی فقہی جزئیات میں صرف کرنا چاہئے تھا۔ تو میں اس کا کیا جواب دے سکوں گا؟ یہ فرمایا اور آبدیدہ ہو گئے‘ پھر سنبھلے اور فرمایا کہ: ہمارے استاذ حضرت علامہ کشمیری پر بھی عمر کے آخری دو سال میں یہ احساس شدید ہو گیا تھا اور رویا کرتے تھے کہ ملت اسلامیہ کی وقتی ضرورت کا کچھ کام ہم سے نہ ہو سکا‘ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے کہاں مدارس کھولے تھے اور قیل وقال میں وقت صرف فرمایا تھا‘ یہ فرما کر پھر رونے لگے اور دعا فرماتے رہے کہ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔ ان کی یہ تڑپ بارگاہِ شکوریت میں قبول ہوئی اور ایک درس وتدریس کے مسند نشین سے اللہ پاک نے ’’ختم نبوت‘‘ کی کامیاب جدوجہد کا کام لیا اور بالآخر قوانین اسلامی کی کونسل کی عملی خدمت ہی کے سلسلے میں مسافرانہ موت عطا فرما کر انہیں شہادت بخشی۔ ایک اور مرتبہ کی حاضری میں جب کہ مولانا کو گٹھیا کی وجہ سے بیٹھ کر اٹھنے میں سخت تکلیف ہوتی تھی‘ مجھ کو قریب آتا دیکھ کر اٹھنے کی سعی فرمانے لگے‘ میں تیزی سے آگے بڑھا اور یہ عرض بھی کرتا رہا کہ زحمت نہ فرمائیں‘ مگر وہ کھڑے ہو ہی گئے اور پھر بیٹھنے کے بعد فرمایا کہ ’’کبر نہ پیدا ہو جائے۔‘‘

اور دیکھئے! حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ، حکیم ایمانی اور شیخ طریقت! کراچی تشریف لائے ہوئے تھے‘ مولانا نے انہیں ناشتہ پر مدعو فرمایا‘ راقم الحروف بھی دسترخوان پر موجود تھا‘ ناشتہ ہو چکا‘ بات مدرسہ عربیہ اسلامیہ کی نکلی‘ مولانا کا حافظہ اعداد وشمار میں بھی بے نظیر تھا‘ مدرسہ کی عمارت کی لاگت، روزانہ کا خرچ اور سالانہ موازنے کی مدات اور متعلقہ رقوم کی مقدار مولانا نے فرفر سنا ڈالی اور یہ بھی فرمایا کہ: یہ شاہ خرچی خاموشی سے پوری ہو جاتی ہے‘ نہ یہاں کوئی اپیل نہ سفیر! حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ساری روداد خاموشی سے سن لی اور پھر فرمایا کہ: ’’مولانا مجھے عمارتوں اور موازنوں سے کوئی دلچسپی نہیں‘ مجھے تو آپ صرف یہ بتلائیے کہ کام

عالمانہ ثقل کی بجائے ادیبانہ لطافت اور شاعرانہ نزاکت رحمت الٰہی کا مژدہ پر مژدہ! خود بھی جھوم رہے تھے اور سامعین بھی مست و سرشار، جگر کا یہ شعر ایک عالم وزاہد پر پوری طرح چسپاں ہو رہا تھا:

شباب رنگین ، بہار رنگین ، وہ سر سے پا تک تمام رنگین
تمام رنگین بنے ہوئے ہیں تمام رنگین بنا رہے ہیں

کھانے پینے میں بھی مولانا کا ذوق نہایت نفیس اور معیاری تھا، وہ کسی پکوان کی جب داد دیتے تو صرف سبحان اللہ یا واہ واہ نہیں ہوتی تھی، بلکہ اپنی ذوق شناسی کا ثبوت اس طرح دیتے کہ اس کے ذائقہ میں مصالحوں کے توازن اور ذائقہ کی اصل عمدگی کی طرف بھی ضرور اشارہ فرماجاتے تھے، جگر مرادآبادی نے اپنے مجموعہ کلام ''شعلہ طور'' کا انتساب بہادر یار جنگ مرحوم کے نام سے کیا ہے، اور وجہ یہ ظاہر کی ہے کہ ان سے زیادہ ''صحیح'' شعر کی داد دینے والا، انہوں نے کسی اور کو نہیں پایا، مولانا سے متعلق میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ: دسترخوان کی صحیح داد دینے والا میں نے ان سے بہتر کوئی نہیں دیکھا، اس مہجور نے مولانا کے دسترخوان پر بار بار ان کے ذوقِ طعام کا لطف اٹھایا اور اپنے دسترخوان پر ان سے داد حاصل کی تھی، چائے تو بلاشبہ جیسی وہ اپنے دستِ خاص سے بنا کر پلاتے تھے، کم پینے میں آئی۔ مولانا اس کا اصول بھی بیان کرتے تھے کہ پیالی میں پہلے شکر ڈالی جائے، پھر چائے اور پھر دودھ اور دودھ جب ڈالا جائے تو پہلے بالائی اس کے اندر گھول لی جائے، ورنہ چائے کا لطف جاتا رہتا ہے۔ ایک مرتبہ غریب خانہ پر از خود تشریف لے آئے، چائے پیش کی گئی، ایک چسکی لی اور فرمایا ''خوب بنی ہے۔'' اگر دو منٹ اور زیادہ دم دی جاتی تو تلخی پیدا ہو جاتی۔ دم دینا ہر ایک کو نہیں آتا۔

مولانا کھانے پینے کے برتن بھی نہایت عمدہ رکھتے تھے، اور برتنے کی چیزوں میں جدید ترین چیزیں ان کے ہاں نظر آتی تھیں، اس معاملے میں ان کا حال، **قل من حرم زینة اللّٰہ التی اخرج لعبادہ والطیبت من الرزق** کی حقیقت کا بے غبار آئینہ تھا۔

لباس میں بھی وہ صاحب ذوق انسان تھے، صاف ستھرا اجلا لانبا کرتا اور ٹخنوں سے اونچی شلوار اور اس پر رنگین عبا، کبھی سیاہ اور کبھی ہلکے سنہری رنگ کی، جوان کے گورے گورے، میانہ قامت اور وجیہ شکل و صورت پر خوب کھلتی تھی، سر پر کوئی ڈیڑھ پونے دو گز کا رومال، کبھی سفید اور اکثر ہلکی چوکڑی والا ہوتا تھا، جو بڑی خوبی سے باندھا جاتا تھا اور اس رومال کے اندر سبز رنگ کی ٹوپی عمامہ سے قدرے ابھری ہوئی بہت زیب دیتی تھی، ان کے مریدوں کو تصوّرِ شیخ قائم کرنے کے اہتمام کی کوئی حاجت نہ تھی، خود بخود نگاہوں میں اتر آئے اور ذہن پر مرتسم ہو جاتے تھے، ان کا جمالیاتی ذوق انہیں دوسروں کے لباس پر بھی جمالیاتی نگاہ ڈالنے پر مجبور کرتا تھا، جہاں لباس کی موزونیت نظر آتی، ان کی زبان سے بے ساختہ تعریف نکل جاتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک صاحب کے سر پر جناح

کیپ بہت کھپ رہی تھی‘ مولانا نے فوراً داد دی۔ ایک عید پر راقم الحروف سیاہ حجازی عبا پہنے حاضر خدمت ہوا‘ مولانا کی نگاہ عبا پر گئی‘ فرمایا: یہ اونٹ کے بال کی بنی ہوئی ہے اور سب سے قیمتی عبا ہے‘ میں نے عرض کیا کہ: یہ عبا مجھ کو اپنے ایک بزرگ خاندان سے ملی ہے اور ان کو سلطان عبدالعزیز مرحوم نے ہدیۃً عنایت کی تھی‘ فرمایا کہ: یہی تو میں دیکھ رہا تھا‘ ایک مرتبہ میری شیروانی کا کپڑا ڈیزائن کے لحاظ سے کچھ یونہی سا تھا‘ مولانا نے دیکھا تو تعجب سے پوچھا کہ یہ آپ کو کیسے پسند آ گیا؟

مولانا کتابوں کے رکھنے اور ان کے برتنے میں بھی بڑے باذوق تھے۔ ہر کتاب کا عمدہ سے عمدہ ایڈیشن خریدتے اور نفیس ترین جلد بنواتے اور اس نفاست سے پڑھتے تھے کہ کسی صفحہ پر کہیں کوئی داغ دھبہ یا قلم اور پنسل کا کوئی نشان نہیں ہوتا‘ ان کی طالب علمی کے زمانہ کی کتابیں آج تک نئی کی نئی معلوم ہوتی ہیں‘ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کا جمالیاتی ذوق بعد میں نشو ونما نہیں پایا تھا‘ بلکہ وہ پیدائشی طور پر یہ ذوق اپنے ساتھ رکھتے تھے‘ اور بدذوقی سے ان کی لطیف طبیعت مکدر ہو جاتی تھی۔

ایک مرتبہ ایک اور عالم کی موجودگی میں، میں نے اپنی ایک تالیف مولانا کی خدمت میں پیش کی‘ ان عالم نے مولانا کے ہاتھ میں سے وہ کتاب لے لی کہ پہلے میں دیکھ لوں، پھر آپ پڑھئے۔ مولانا خاموش ہو رہے اور وہ عالم کتاب لے کر چلے گئے‘ مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ: اب وہ کتاب میرے کس کام کی رہ گئی، میں تو ہرگز واپس نہ لوں گا‘ اس لئے کہ وہ صفحہ اس بری طرح پلٹتے ہیں کہ وہ مڑ جاتا ہے اور پھر درمیان میں لکیریں بھی کھینچ دیتے ہیں‘ مجھ سے ایسی کتاب پڑھی نہیں جاتی۔

جمالِ یوسفی کی پوری عکاسی کون کر سکے‘ چند جھلکیاں ایک ناقص مصور جیسی کچھ پیش کر سکا‘ وہ ایک جذبہ والہانہ کا کرشمہ ہے‘ اس کو اس بات کا پورا شعور ہے کہ اس کا ممدوح مخدوم العلماء ہی یگانہ روزگار ہے‘ فخرِ ملت ہے اور اس شعور کے ہوتے دل لرزتا ہے کہ کوئی بات اوروں کی نہیں‘ خود اپنے ممدوح کی طبع لطیف پر ناگوار نہ گذر جائے‘ مگر ان کا تصور خود تسلی دیئے جا رہا ہے‘ سیرتِ یوسفی کا یہ پہلو دیکھنے دکھانے کا ضرور تھا‘ اچھا ہوا کہ پیش کر دیا گیا:

یوسف اس کو کہوں او رکچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

اعلیٰ للہ مقامہ وقدس سرہ العزیز

☆......☆......☆